بہاؤ

مُنتظر حسین تارڑ

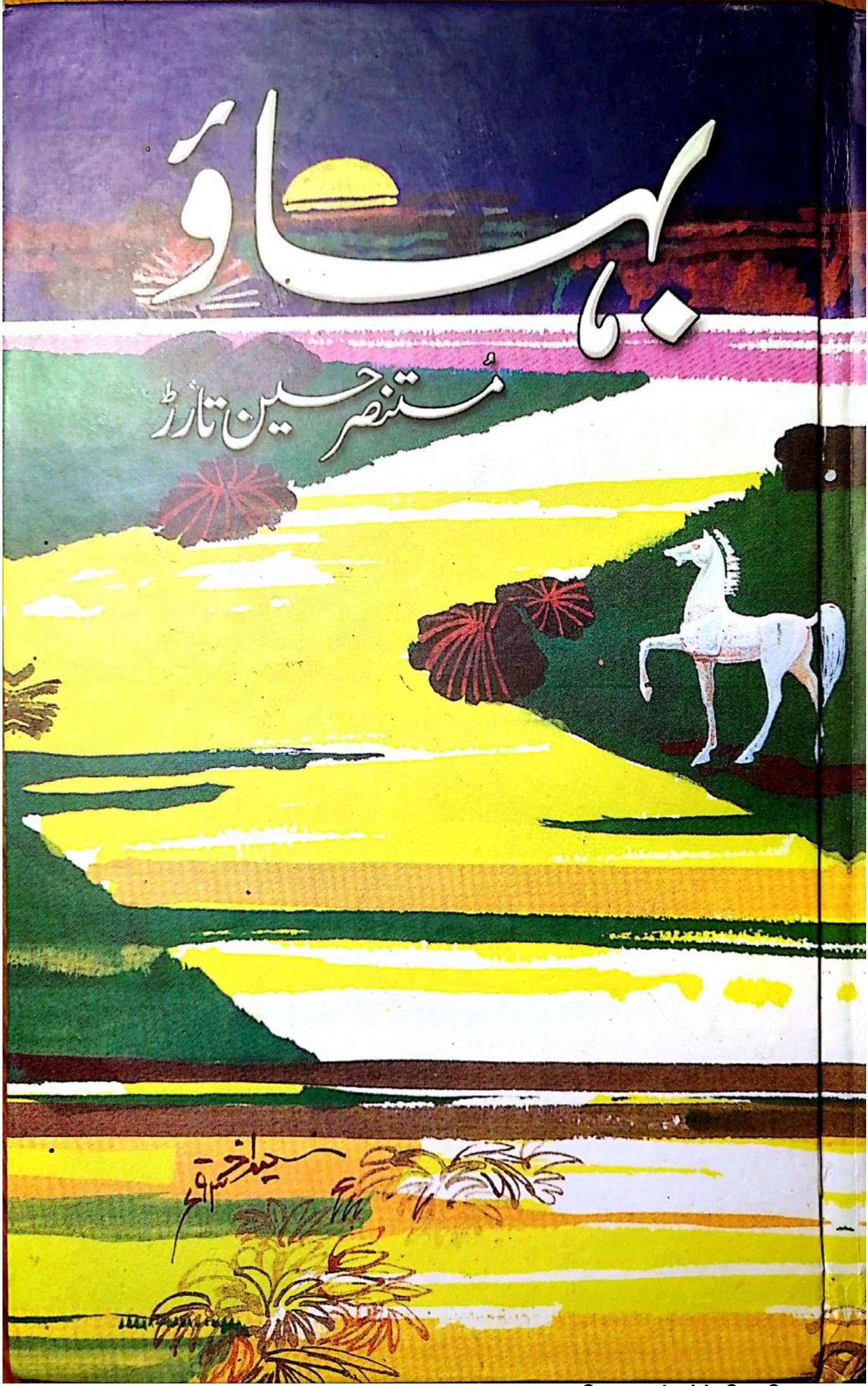

Scanned with CamScanner

بہاؤ

بہاؤ ایک ایسا ناول ہے جس میں تاریخ، علم البشریات، لسانیات، عمرانیات، ایک مخصوص خطے کا بنتا بگڑتا جغرافیہ اور تمدن ایک نکتے پر مرتکز ہو کر ایک دلچسپ و حیرت انگیز تحریر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ حیرت انگیز اس لیے کہ ایک ایسی بستی جو ہزاروں سال پہلے اپنی معدوم ہوتی ہوئی خصلت کے ساتھ موجود تھی ناول نگار کے کرب آمیز طویل مطالعہ کی راہ سے گزرتے ہوئے ایک اہم دستاویزی ریکارڈ میں تبدیل ہو گئی ہے۔

برصغیر کی قدیم تاریخ کے زمانی حوالے عمرانیات کے شائقین کے پاس محفوظ ہیں ایک ایسے علم کے خزانے کے طور پر جس میں محدود طبقے کو دلچسپی ہوتی ہے لیکن یہ یہی علم فکشن میں ڈھل کر اپنی وسعت میں ایک قابل ذکر تحریر بن جاتا ہے۔

اچھے ناول کا مطالعہ قاری کو کرب سے گزارنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس طرح اس کا خالق شدید کرب سے گزرتا ہوا بالخصوص جب کہ اس کے پیچھے تاریخ اور گزر جانے والے معاشروں کے تمدنی و ثقافتی رویوں کا بیان کرنا مقصود ہو اور یہ بیان ایسے واقعات کی سچائیوں پر مشتمل ہو جن پر ہم ایمان لانے کو فی الفور تیار ہو جائیں۔

بہاؤ ہمیں ہزاروں سال پرانی ایک ایسی بستی کی سیر کراتا ہے جو سندھو گھاگرا کے کنارے واقع تھی اور آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ناول نگار مستنصر حسین تارڑ نے بیانیہ کے دوران دو کرداروں پورن اور ورچن کے مکالموں کے ذریعے ایک چشم کشا حقیقت

Scanned with CamScanner

کا اعتراف کرایا ہے۔ یہ حقیقت مختلف معدوم ہو جانے والے معاشروں کے حوالے سے اپنا اثبات کراتی رہی ہے۔ اس میں بڑی عبرتیں پوشیدہ ہیں اور آج بھی جدید دور میں اپنی آزادی کے خطرات سے دوچار معاشروں کو اس سے سبق سیکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ پورن جو موہن جو دڑو کے ترقی یافتہ معاشرے سے تعلق رکھتا ہے ورچن سے کہتا ہے۔

''ورچن تمھارے جسموں میں الکس ہے اور تمھاری آنکھوں میں نیند ہے اور تمھارے دریا سست ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی زمین کا پتر نہیں ہوتا۔ زمین پر پیدا ہونے سے وہ تمھاری نہیں ہو جاتی جب تک کہ تم اس کی خدمت نہ کرو۔ اس کی چاکری نہ کرو۔ تمھاری بانہوں میں تو زور ہی نہیں رہا۔ تم کیا خدمت کرو گے۔'' (۱)

ورچن معدوم ہوتی ہوئی ہزاروں سالہ پرانی بستی کا وہ فرد ہے جسے احساس ہے کہ وہ ایک کمتر قوم کا فرد ہے جسے موہن جو دڑو کے لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ پہاڑوں سے اترتے ہیں اور سندھو کے میدانوں میں پھیلتے ہیں اور کالی دھات سے ان کے سروں میں دراڑیں ڈالتے ہیں، اس کے یہاں کی عورتیں لے جاتے ہیں اور بستی کو اجاڑتے ہیں، کیوں کہ وہ باہمت نہیں وہ ظالم اور جارح کا ہاتھ نہیں مروڑ سکتے۔ ورچن موہن جو دڑو کے لوگوں کو دیکھتا ہے تو دنگ رہ جاتا ہے۔ ان کی رنگت ناک نقشے اور قد وقامت اور ان کے جانوروں کو دیکھ کر جو ان کے مکانوں کے پچھواڑے نالیوں کو ڈھکنے والی پکی اینٹوں پر چلتے تھے، اس کا اندر لٹ جاتا ہے تاہم اس کی مشاہداتی قوت اس کو یہ سب کچھ دیکھنے پر مجبور کرتی ہے تب ہی وہ ایک ترقی یافتہ استحصالی قوت سے آنکھیں ملاتا ہے اور اندر ہی اندر کٹ کر رہ جاتا ہے۔

پورن موہن جو دڑو کے ترقی یافتہ معاشرے کے ان گنے چنے افراد میں سے ایک ہے جو چاہتا ہے کہ کسی طرح ورچن کی بستی اور اس کی بستی ایک ہو جائے استحصال کے نام پر نہیں بلکہ انسانیت کے نام پر مگر وہ اس بستی کے مقدر کو، بدلنے پر قادر نہیں اگر اپنی حالت

Scanned with CamScanner

کے بدلنے کا خیال نہ ہو تو پورن جیسے افراد مرتی اور سسکتی قوم میں روح نہیں پھونک سکتے۔ وقت کے سیل رواں میں حوصلہ مند اور آگے کی جانب دیکھنے والے ہی زندہ رہ جاتے ہیں۔ اسے اہم ایک ارتقائی عمل قرار دے سکتے ہیں۔ جس میں وقت اپنا عمل دہرائے چلا جا رہا ہے وہ کسی کو کچلتا ہوا چلا جا رہا ہے تو کسی کو آگے ہانک رہا ہے۔ مستنصر کے یہاں وقت کی میکنزم Mechanism سائنسی ہے۔ جو جس کی لاٹھی اس کی بھینس Survival of the Fittest کے نغمے کو الاپتا چلا جا رہا ہے۔ جس کے جلو میں تمدن اور ثقافت کے ان گت مظاہر بھی جلوہ گر ہوتے ہیں لیکن جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے فلسفے کو منفی انداز سے مستنصر نے پیش نہیں کیا ہے۔ جس کے تحت مغربی سامراجیت کے وہ ہولناک اقدامات ذہن میں در آتے ہیں جس نے برطانیہ فرانس، جرمنی، اٹلی وغیرہ کو مجبور کیا کہ وہ بے بس مجبور اور شریف قوموں کو باہمی یگانگت، تجارت اور دوستی کے نام پر اپنا غلام بنالیں ان کی دولت لوٹ کر عظیم سائنسی، تہذیبی اور تجارتی قومیں بن جائیں۔ مستنصر نے موہن جو دڑو کے پورن کے مکالمے کی اصل روح کو اپنے بیانیہ میں ڈورگا کے ذریعے پیش کر دیا ہے جسے یہ احساس ہے کہ اسے اینٹوں کے بھٹے بنانے کے عمل میں جانور کا روپ عطا کر دیا گیا ہے۔ ڈورگا جو معدوم ہوتی ہوئی بستی میں اپنی روح پر مرتسم ہو جانے والے زخموں کے ساتھ آچکا ہے۔ پکلی سے کہتا ہے۔

''میں جھکا ہوا بندہ ہوں پر یہ جھکاؤ میرا اپنا نہیں بلکہ اس زور کا ہے جو برسوں سے میرے جسے پر کچھو کی طرح سوار تھا پر میں خود جھکتا ہوں تو نرا تیرے سامنے کہ تو نے مجھے گھر کا سواد چکھایا۔ مجھے وہ کچھ دیا جو بے انت برسوں پہلے کبھی میرے ایسے بندوں کے پاس ہوا کرتا تھا ایک آسرا اور بال بچے اور چولہے پر ہانڈی اور پھر یہ سب کچھ مجھ سے چھن گیا اور مجھے جنور بنا دیا گیا میں سیدھا آسمان کو دیکھتا تھا پر مجھے جھکا دیا گیا تو پھر یہ ہے کہ میں پھر سے سیدھا ہونا چاہتا ہوں۔'' (۲)

Scanned with CamScanner

دوسری جگہ وہ ورچن سے کہتا ہے۔

''ہاں... اور یہ میں نے بنائی ہے اور میں اینٹ ہزار برس سے بنا رہا ہوں پر ورچن میں صرف بنا رہا ہوں تم جانتے ہو کہ بھٹے کی چار دیواری۔ کچھ پتا نہ تھا کہ ہم جو اتنی ڈھیر ساری اینٹیں پکاتے ہیں تو وہ کہاں جاتی ہیں اور ان سے کیا بنتا ہے اور جب میں اس چار دیواری سے باہر نکلا تو میں نے پہلی مرتبہ وہ دیواریں اور حویلیاں اور کنگ گودام دیکھے جو میری بنائی اور پکائی ہوئی اینٹوں سے بنے تھے اور ان میں لوگ اور تھے جو رہتے تھے ایسے لوگ جو کبھی بھٹے کے اندر نہیں گئے تھے اور انھیں پتا نہ تھا کہ ایک اینٹ بنانے میں اور پکانے میں کتنا پسینہ بہتا ہے اور کتنا منہ خشک ہوتا ہے اور کتنا جسم جھلتا ہے اور لوگ میری بنائی اینٹوں میں رہتے تھے اور تب میں کشتی پر سوار ایک کونے میں منہ چھپائے بیٹھا تھا اور تمھیں دیکھتا تھا اور اس موہن جو دڑو کو دیکھتا جو میری پیٹھ سے پرے ہٹتا جاتا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ کبھی میں اپنے لیے بھی اینٹ بناؤں گا اور پکاؤں گا اور اس سے ایک چار دیواری بناؤں گا اور دیکھوں گا کہ اس کے اندر جانا کیسا لگتا ہے۔'' (۳)

''میں اس ساری حیاتی کی بات کرتی ہوں کہ یہ کیوں ہے؟ اور ہم سب جنوروں کی طرح بندھے ہوئے اس طرح کیوں کرتے چلے جاتے ہیں جس طرح ہم سے پہلے بے انت برسوں سے جب یہ دکھ نہ تھے اور تب تک یہ دکھ نہ ہوں گے تب تک ہم ایسے کیوں چلے جاتے ہیں اناج کے لیے... اپنے بیج کو آگے بڑھانے کے لیے اسی طرح ہم حیاتی کیوں گزارتے ہیں؟'' (۴)

Scanned with CamScanner

اپنے بچے کو ٹھکانے لگانے کے لیے وہ اپنا طریقہ ڈھونڈتی ہے۔

''اس پر گھاس ڈالوں گی اور اس پر کنک کے دانے تاکہ کوے انھیں کھالیں اور تمھیں نہ کھائیں۔'' (۵)

اگر پاروشنی کی جبلت میں تخلیق اور تحقیق ہے تو سمرو کی فطرت میں فن کی تخلیق ہے وہ منکے اور مہریں بناتا تھا اور ان کو جانوروں کی تصاویر سے مزین کرتا تھا وہ پتھر سے کدالیں اور کسیاں بناتا اور اپنے حق کو بہتر بنانے کی تگ و دو کرتا۔ ہر اچھے آرٹسٹ کی مانند اسے عورت ذات میں کشش نظر آتی ہے۔ پاروشنی اسے اور اس کے فن سے محبت کرتی تھی۔ سمرو سے ہٹ کر جو کردار ایک بے چین روح کی نمائندگی کرتا ہے وہ ورچن ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے ماحول سے نکل کر دوسری دنیاؤں کی سیر کرنے اور دوسرے انسانوں کو سمجھنے اور ان سے اپنا اور اپنی سسکتی ماحولیاتی ہیئت سے موازنہ کر کے نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہے۔ وہ بہت آگے جا کر پھر واپس آ جاتا ہے۔ پورن سے اس کا مکالمہ جو اس کی دنیا کے وجود بلکہ انسانی وجود سے متعلق ہے۔ ناول کا وہ باب ہے جسے مستنصر حسین تارڑ کی عالمانہ بصیرت نے تخلیق کیا اور یہ ہی ناول کے وژن کا ضامن ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ورچن اور دوسری طرف پورن دونوں میں ایک ہی مستنصر حسین تارڑ چھپا ہوا ہے جو ان کے اذہان کو متحرک کر کے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو آشکار کر رہا ہے۔

ان سے ہٹ کر دیگر کردار بھی اپنی اپنی جبلت اور اپنے ماحول کے اسیر ہیں یہ سب جانوروں، اشیا، ہواؤں اور تشکیل بہتے اور سوکھتے، پانیوں، سمیت ایک متحدہ زندگی کی تشکیل کرتے ہیں جو آگے چل کر ختم ہونے والی ہے۔ ان میں نندی، گجرو، راچو، مامن دھروا، ناگری، گیرو، چمرو، پکلی، اس کے بچے پنڈو اور سکرا، کاگری وانگو، چندرو، کواسی، چیوا، مانا ہنگا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب ایسی زبان بولتے ہیں جو سراسر مستنصر حسین تارڑ نے ایک طویل تحقیق اور ریاضت کے بعد تلاشی ہے۔ مستنصر حسین چاہتے تو شاید یہ ہی پوری زبان وہ استعمال کر لیتے مگر اردو میں پرانی دراوڑی، برسوں پرانی پنجابی اور سندھی علاقوں کی

Scanned with CamScanner

زبان کے الفاظ کی آمیزش سے انھوں نے ایک لطیف قسم کا حسن تخلیق کر دیا ہے۔ ان کرداروں کے نام ہی سے محسوس ہوتا ہے کہ ایسے ہی ہوں گے اور پھر وہ الفاظ بھی اپنی ذات میں ان حقیقی الفاظ کا تاثر دیتے ہیں۔ گویا کہ ماقبل تاریخ وہ ہی استعمال ہوتے ہوں گے۔ اس طرح مستنصر حسین فکشن کی دنیا سے برآمد شدہ ماہر لسانیات بھی نظر آتے ہیں۔ جن کو دس میں سے دس نمبر دینے کو طبیعت چاہتی ہے۔ آیئے ان مانوس و نامانوس الفاظ سے لطف لیں۔

جھیل کے پانی کا رکھوں تک آنا۔ دریائی سروٹ سے بنا چھپر۔ پکلی ایک صحتک کے درمیان بوٹے الیکبنا، پاروشنی کا اپنے سینے پر کسے ہوئے لیڑے کو ڈھیلا کرنا۔ بھوکڑ کا خالی آسمان میں چکر لگانا۔ پانی کی اڈیک میں بیٹھنا، موہن جوداڑو کو مہاندرہ کا حاصل ہونا۔ ورچن کا اپنے آپ کو آنا سا سمجھنا، چیتر کا اخیر ہونا، پاروشنی کے پنڈے کا کسمسانا۔ بستی کے وسنیکوں کا کھیت کھودنا۔ مگھر کے سیت پالے کا پروشی میں اترنا۔ آوا چڑھنا۔ گھانی کا بننا۔ سمرو کے مہاندرے کا لال ہونا۔ یم کے کتوں کا آ کر انسان کی روح کو لے جانا۔ پھر اس قسم کے الفاظ بھی ہیں۔ اپایاندی، کبھاندی، دریانا، جھجھر، ساگ انگ، کالی بنگن، دوشتی، شقندری، چاٹی، چونی، بھانڈے ٹنڈر، بھڑولے، جھانواں، چنگیر وغیرہ۔

یہ سب تھوڑی سی مثالیں ہیں ورنہ ناول کا ماجرا ایسے اور ان جیسے ہزاروں الفاظ سے ترتیب پاتا ہے۔ ان الفاظ کا علم، پھر استعمال اور ان سے ماقبل تاریخ کے ماحول کے تانے بانے بننا بذات خود حیرت انگیز محققانہ تخلیقی عمل ہے۔ اس کی اہمیت کو تحریر کے کرب سے گزرنے والا زیادہ بہتر طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ''آگ کا دریا'' کے لیے ماقبل تاریخ کے بجائے محفوظ Recorded تاریخ کو جنم دیا تھا اور شروع کے ابواب میں برصغیر کے قدیم ماحول کی بازیافت کے لیے کچھ ہندی الفاظ انتہائی فنکارانہ انداز سے استعمال کیے تھے جو اس ماحول پر سجتے بھی تھے بالکل یہ عمل مستنصر حسین تارڑ نے بھی دہرایا ہے مگر انھوں نے زبان کو دریافت بھی کیا ہے اور ساتھ ہی اس معدوم ہوتے ہوئے کلچر اور

Scanned with CamScanner

ماحول کو بھی جو وقت کے ساتھ فنا ہو گیا۔ اس کے پیچھے جو دستاویزیت Documentation کی تشکیل سے وابستہ محققانہ ریاضت ہے وہ قابل تعریف امر ہے۔ اس لیے اس ہم ایک Docu-Novel بھی کہہ سکتے ہیں۔ اتفاق سے ہمارے ناول کی دنیا دستاویزی رجحان (جس میں دیگر رجحانات کے دھارے بھی آ کر مل جاتے ہیں) کی بنیاد پر تخلیق شدہ اور ناولوں مثلاً دشتِ سوس (جمیلہ ہاشمی)، جانگلوس (شوکت صدیقی)، سنگم (ڈاکٹر احسن فاروقی)، گردشِ رنگِ چمن، آخر شب کے ہم سفر، چاندنی بیگم (قرۃ العین حیدر) راجہ گدھ (بانو قدسیہ بحوالہ قرآن مجید میں دیا گیا رزق حلال اور رزق حرام کا نظریہ کہ رزق حلال باعث برکت ہے اور رزق حرام باعث ہلاکت) کے سلسلے میں بڑا خود کفیل ہے اور یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ''بہاؤ'' کے بعد اس رجحان کو مزید تقویت ملے گی اور ماجرے کے حوالے سے اس میں نئی نئی جہات بھی تخلیق ہوں گی۔

آخر میں ''بہاؤ'' میں پنہاں زندگی کی بصیرت یا اس میں سموئے گئے وژن پر بات کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق ناول کے قصے کے اٹھان پر ہے۔ اس مضمون کے شروع میں ورچن سے پورن کا طنزیہ مکالمہ دیا گیا ہے جس میں وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ زمین پر پیدا ہونے سے وہ کسی کی نہیں ہو جاتی جب تک کہ اس کی خدمت اور چاکری نہ کی جائے اور یہ کہ جن کی بانہوں میں زور ہی نہیں وہ کیا خدمت کریں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں ناول ایسی بستیوں اور ایسی قوموں کے لیے نوشتہ دیوار The Writing on the Wall کا کردار انجام دیتا ہے جو وقت کے تقاضوں کا ادراک نہ کرتے ہوئے روشن خیالی، سائنسی علوم، اپنے وجود کی حرمت، ہمہ گیر بھائی چارے، انسانی جان کے احترام اپنی مٹی سے حقیقی محبت جیسی اعلیٰ اقدار سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے جاہلانہ اور ہلاکت خیز منصوبے کے تحت ان سے جنگ کر رہے ہیں اور اس کا شعور نہیں رکھتے کہ مختلف قسم کے مہلک تعصبات، تاریخ کی فراہم کردہ بے بنیاد و منفی نفرتوں اور عداوتوں کے زہر سے ان کا اپنا ''اندر'' گل سڑ جائے گا۔ وہ نہیں جانتے کہ لکڑی کو دیمک اندر سے چاٹتی ہے، جسم کی

Scanned with CamScanner

مٹی میں سرطان کا بیج بونے کے بعد کوئی ہلاک ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ وقت Time کی اپنی سائنسی میکنزم ناقابل تبدل ہے۔ وہ قوم جسے اپنی حالت کے بدلنے کا شعور نہ ہو، وہ مٹی میں مل کر مورخین کے لیے مواد چھوڑ جاتی ہیں۔ اتفاق سے آج کا مورخ فکشن نگار بھی ہے۔ ایک نقاد نے تو ناول نگار اور مورخ کو فرسٹ کزنز Cousins قرار دیا ہے۔ لہٰذا تاریخ کا علم اپنے آپ کو اچھے ناول نگار کی گہرائی نظر سے نہیں بچا سکتا۔ مورخ کے یہاں زیادہ تر تعصبات ملتے ہیں لیکن ناول نگار کا وژن یا مستنصر حسین تارڑ کا نقطۂ نظر آج کی تیزی سے بدلتی ہوئی سائنسی ایجادات کے بوجھ تلے دبی دنیا میں اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد جیسے معروف افسانہ نگار و نقاد نے بھی یہ ہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ''بہاؤ'' پر اپنے مضمون میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''مستنصر کا مسئلہ صرف اپنی جڑوں کی تلاش نہیں بلکہ اس سارے عمل کی بازیافت سے وہ ایک اہم پیغام دے رہا ہے کہ ہمارا عہد بھی دریائے گھاگھرا کے کنارے آباد بستی کی طرح اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم نے بھی اپنے گرد ایک حصار کھینچ لیا ہے جہاں تازہ ہوا اور نئے امکانات کا گزر اب خال خال ہی ہے۔'' (۶)

ڈاکٹر رشید امجد کے یہ الفاظ کہ ... ہم نے بھی اپنے گرد ایک حصار کھینچ لیا ہے... موجودہ عالمی تناظر میں بلیغ اور معنویت سے بھرپور ہیں۔ انھوں نے اکیسویں صدی کی دستک کا بھی خوب حوالہ دیا ہے۔ اس دستک کی دھمک، بہاؤ پڑھتے ہوئے محسوس بھی ہوتی ہے۔ اس کا اطلاق برصغیر ہندو پاک پر تو ہوتا ہی ہے مگر، مغرب اور بالخصوص اپنے واحد عالمی طاقت کے نشے میں سرشار امریکا کی سیاسی، اقتصادی اور سامراجی چیرہ دستیوں اور منصوبہ بندیوں کے حوالے سے تیسری دنیا کے کئی اور ممالک کو بھی جاگنے اور صحیح سمت میں وقت کے راہوار کے ساتھ سفر کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ''تمھاری داستان بھی نہ ہوگی، داستانوں میں'' والی ضرب المثل آئندہ زمانوں میں، دہرائی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ

Scanned with CamScanner

ناول دستاویزیت، تاریخ، علم البشریات، عمرانیات، ارضیات، تحقیقی لسانیات کا اثبات کراتا ہے اور انتہا ہی کیفیت کی بھی اپنے وژن کے اعتبار سے عکاسی کرتا ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ تارڑ نے ماقبل تاریخ کو اپنی تخلیقی قوت سے خوب خوب جنم دیا ہے اور ماجرے کو اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ شروع سے آخر تک اس کی غواصی کیے بنا چارہ نہیں رہتا۔ ہمارے معروف افسانہ نگار، ناول نویس اور نقاد ڈاکٹر احسن فاروقی نے ہنری جیمس کے طویل مقالے دا آرٹ آف فکشن The Art of Fiction سے اس کے اس مقولے کو اپنے کئی مضامین اور اپنی کتاب ''اردو ناول کی تنقیدی تاریخ'' میں کئی بار دہرایا ہے کہ اس ناول کو وجود میں رہنے کا حق نہیں جو دلچسپ نہ ہو۔ ''بہاؤ'' کا یہ وصف ہمارے اردو ناول کے ارتقا اور امکانات کے حوالے سے قابل ذکر ہے۔

Scanned with CamScanner

حواشی

(۱) بہاؤ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء ص: ۶۳

(۲) بہاؤ ایضاً ایضاً ص: ۱۷۹

(۳) بہاؤ ایضاً ایضاً ص: ۱۹۳

(۴) بہاؤ ایضاً ایضاً ص: ۱۵۱

(۵) بہاؤ ایضاً ایضاً ص: ۱۵۱

(۶) دریافت، کراچی، جلد: ۳، شمارہ: ۹، ۱۹۹۵ء

Scanned with CamScanner

بہاؤ ناول

بہاؤ ، پاکستان سے شائع ہونے والا اردو ناول ہے جسے اردو کے مشہور و معروف مصنف مستنصر حسین تارڑ تحریر کیا ہے۔

"بہاؤ" میں اُن کا فن اپنے اوج پر نظر آتا ہے، پڑھنے والوں نے خود کو حیرت کے دریا میں بہتا محسوس کیا۔ اس ناول کا مصنوع وادیٔ سندھ کی تہذیب ہے۔ اِس ناول میں تارڑ نے تخیل کے زور پر ایک قدیم تہذیب میں نئی روح پھونک دی۔ "بہاؤ" میں ایک قدیم دریا سرسوتی کے معدوم اور خشک ہو جانے کا بیان ہے، جس سے پوری تہذیب فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے[1]۔

طرز نگارش وزبان

ناول کی زبان انتہائی منفرد ہے اس میں سندھی، سنسکرت، براہوی اور سرائیکی زبان کے الفاظ جابجا ملتے ہیں جس سے ناول کا طرزِ تحریر اور اسلوب منفرد ہو جاتا ہے۔ "بہاؤ" کی طرزِ تحریر و زبان کی مثال ملنا مشکل ہے، یہ ایک انوکھی تخلیق ہے بقول مصنف یہ ایک (Myth) متھ ہے۔ "بہاؤ" میں مستنصر حسین تارڑ ماہر بشریات (Anthropoligistt) نظر آتے ہیں۔

ناول کی تخلیق و مرکزی خیال

"بہاؤ" کی بُنت کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں،

"دراصل مجھے رات میں اٹھ کر پانی پینے کی عادت ہے۔ میں سائیڈ ٹیبل پر پانی سے بھرا گلاس رکھ لیتا ہوں۔ اور میں شیشے کا گلاس نہیں رکھتا۔ مجھے پکے گلاس میں پانی پینے کی عادت ہے۔ تو وہ بہت گرم رات تھی۔ جب نیم غنودگی میں اٹھ کر میں نے پانی پیا، تو احساس ہوا کہ گلاس میں، میرے اندازے کے مطابق، جہاں تک پانی ہونا چاہیے، وہ اُس سے تھوڑا کم ہے۔ بیرونی حصے میں پانی کی ٹھنڈیا نمی وہاں محسوس نہیں ہوئی، جہاں پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا، جب "بہاؤ" کا ابتدائی خیال کہ پانی خشک ہو رہا ہے، میرے ذہن میں آیا۔ پھر میں نے ایک آرکیالوجسٹ، رفیق مغل کی تحریر پڑھی، جو چولستان کے بارے میں تھی۔ اس میں ایک لائن تھی، جو مجھے اب تک یاد ہے :اساطیری دریا سرسوتی ان دنوں

Scanned with CamScanner

چولستان میں بہا کرتا تھا۔ پھر کسی نامعلوم سبب وہ خشک ہو گیا! یہ سطر میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔ میں چولستان گیا۔ وہاں مجھے وہ ٹھیکریاں سی ملیں، جنھیں میں نے بعد میں ناول میں استعمال کیا۔ پھر مزید تحقیق کی، ناول کی شکل سامنے آئی۔ تو جیسا میں نے کہا، میں اپنے کام پر بہت محنت کرتا ہوں۔ شاید اسی وجہ سے "بہاؤ" کو پسند کیا گیا، اور اس نے اپنی جگہ بنا لی

مستنصر حسین تارڑ بہاؤ (ناول) کی تخلیق و تحقیق کے تجربے کو یوں بیان کرتے ہیں،

اُسے لکھنے میں وقت نہیں لگا۔ اصل وقت تحقیق میں لگا۔ زبان کا کیا رنگ ڈھنگ ہونا چاہیے؟ یہ اہم سوال تھا۔ جب میں نے اُسے لکھنا شروع کیا، تو پچاس ساٹھ صفحات لکھ کر اُسے پڑھا۔ اندازہ ہوا کہ جو زبان میں نے لکھی ہے، وہ آج کی زبان ہے۔ مثلاً لڑکا لڑکی سے کہتا ہے "مجھے تم سے محبت ہے!" اب پانچ ہزار سال پہلے تو یہ بات اِس طرح نہیں کہی جاتی ہو گی۔ منشی پریم چند کے زمانے میں بھی محبت کا اظہار اِس طرح نہیں کیا جاتا تھا۔ اِس کے بجائے کہا جاتا تھا: "تم نے مجھے موہ لیا ہے"۔ اگر ساٹھ ستر سال میں Expression اتنا تبدیل ہو گیا، تو پانچ ہزار سال پہلے کا Expression کیا ہو گا۔ پھر چند ماہر لسانیات، مثلاً علی عباس جلال پوری اور فرید کوٹی سے مشورے کیے کہ اُس زمانے میں کون کون سی زبانیں تھیں۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں مجھے The ancient Tamil poetry کے موضوع پر برکلے یونیورسٹی کا ایک تھیسس ملا۔ یہ بڑا دل چسپ امر ہے کہ تامل اور براہوی، دو زبانیں ایسی ہیں، جنھوں نے دراوڑی زبان سے سب سے زیادہ الفاظ لیے۔ میں نے سوچا کہ قدیم تامل شاعری کا Expression ضرور اُس زمانے میں رائج دراوڑی بولی کے قریب تر ہو گا۔ تو اس تھیسس کا پورا مطالعہ کیا۔ ردھم اور اس زمانے کے استعاروں کو سمجھا۔ "بہاؤ" میں آپ کو کوئی جدید استعارہ نہیں ملے گا۔ جب کردار کی چال کا تذکرہ آتا ہے، تو یہ کہا جاتا ہے؛ اُس کی چال اتنی خوب صورت تھی کہ شہد کی مکھیاں اُس کے پیچھے پیچھے چلی جاتیں۔ یا پھر؛ اس کے (Hip سرین) کوبرا کے پھن کی طرح تھے، جن میں زہر بھرا تھا، جن سے وہ مجھے ڈس سکتی تھی۔ یعنی میں نے قدیم تامل شاعری پڑھی، اور اس میں اختراع کی۔ اگر مجھے پیٹرن مل جائے، تو میں اختراع کر لیتا ہوں[1]۔

"

ناول کا مرکزی کردار

ناول کا سب سے مضبوط کریکٹر پاروشنی کا ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں،

"پاروشنی ایک ایسی لڑکی تھی، جو بہت خوب صورت تھی۔ میرے اور اُس کے درمیان ایک رشتہ تھا۔ Understanding کا رشتہ، یا اور محبت کا رشتہ کہہ لیں۔ پاروشنی اسی کا سراپا ہے۔ چال ڈھال، جسمانی خطوط میں نے وہاں سے لیے، مگر میں اسے پانچ ہزار سال پیچھے لے گیا۔"

مجموعی جائزہ

مستنصر حسین تارڑ کے ناول "بہاؤ" کو بجا طور پر اردو کا ایک بڑا ناول کہا جا سکتا ہے۔ یہ ناول ایک ایسا شاہکار ہے جو اپنے اندر صدیوں پرانے جہانِ رنگ و بو کو سموئے ہوئے ہے۔ اس ناول میں انسان اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ انسان کی موجودگی سے زندگی کے تار و پود کو دوام حاصل ہے۔ انسان کی تہذیب، انسان کی کہانی ہے۔ اس تہذیب کا ارتقا آدمی کے دمِ قدم سے ہے۔ آدم کی پہلی تہذیب زرعی تہذیب تھی اور انسان کا اوّل شاہکار مٹی سے ظروف سازی تھی۔ زمانے میں نشیب و فراز آتے ہیں۔ پرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب لے لیتی ہے۔ کھنڈروں کی جگہ نئی بستیاں آباد ہو جاتی ہیں۔ پرانی چیزیں فنا اور نئی چیزوں میں بقاء پیدا ہو جاتی ہے مگر انسان ہر حال میں باقی رہتا ہے۔ ہر طرح کے حالات و حادثات کے باوجود انسان بچ نکلتا ہے۔ پرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب، کھنڈر کی جگہ عمارت اور پرانی کی جگہ نئی چیز، ان سب کی تخلیقیت آدمی کے ہونے سے وابستہ ہے۔ اور یہی سب مستنصر حسین تارڑ کے ناول کا مرکزی تھیم ہے[2]۔

اس ناول میں حیران کن چیز، مستنصر حسین تارڑ کا مضبوط تخیل ہے جو پانچ ہزار سال پہلے کی تہذیب ہماری آنکھوں کے سامنے لا کھڑی کرتا ہے۔ ناول قاری کو اُس تہذیب کا حصہ بنا دیتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو اسی ماحول کا باسی سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اُن کرداروں کا ساتھی بن جاتا ہے۔ اُن کے دُکھ سُکھ کا سانجھی اور خوشی و شادمانی کا شراکتی ہوتا ہے۔ ناول کے کردار جاندار اور جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس ناول میں جو تخلیقی دریافت ہے وہ تباہی (Disaster) ہے۔ جو بالکل منفرد قسم کی ہے۔ ایک فطری تباہی (Natural Disaster) ہوتی ہے، جیسے آندھیاں آتی ہیں، طوفان آتے ہیں، سمندر میں سونامی پیدا ہوتا ہے وغیرہ۔ دوسرا تباہی کا

Scanned with CamScanner

وہ پہلو ہے جس میں انسان خود ملوث ہے۔ جو انسان خود اپنے ہاتھوں سے لاتا ہے۔ جیسے ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم بم گرایا۔ جیسے عراق اور افغانستان میں فاسفورس اور ڈیزی بم پھینکے لیکن جو تباہی (Disaster) مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول "بہاؤ" میں دکھائی وہ اُن دونوں اقسام کی تباہی سے ہٹ کر ہے۔ وہ نہ فطرت لاتی ہے نہ انسان خود لاتا ہے بلکہ غیر محسوس انداز میں آتی ہے۔ یہ تباہی کا ایک الگ سا انداز ہے جو تخلیقی فن پارے "بہاؤ" میں ملتا ہے کہ سرسوتی اور گنگا دریا میں پانی کم ہونے لگتا ہے۔ دریا آہستہ آہستہ اتنا خشک ہو جاتا ہے کہ زندگی تعطل کا شکار ہو جاتی ہے اور پانی (دریا سے وابستہ) جو زندگی کا اہم عنصر ہے مفقود ہو جاتا ہے۔ اس تباہی سے بہت سے حیوانات مر جاتے ہیں۔ کچھ دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں۔ ڈائنوسار جیسے بڑے جانور ختم ہو جاتے ہیں مگر انسان واحد حیوان ہے جو محفوظ رہتا ہے۔ اس ناول کا دل چسپ عنصر بھی یہ ہے کہ انسان، ایک ایسی عجیب و غریب چیز ہے جو ان تمام حادثات و واقعات اور تباہی (Disaster) کے بعد بھی بچ نکلنے میں کامیاب رہتی ہے[2]۔

اس ناول میں کرداروں کے نام اور اُن کے کار منصب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پاروشنی (ایک دانش ور خاتون)، پکلی (مٹی کے ظروف بنانے والی)، ورچن (ایک سیاح)، سمرو (کسان)، مامن ماسا (درویش) گاگری اور چیوہ (میاں، بیوی کی علامت)۔ ان کرداروں کے ذریعے اس قدیم عہد کی معاشرت اور سائیکی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر اس ناول میں جو اہم ترین بات ہے کہ انسان اپنی تہذیب و ثقافت کو بھی مصنوعات کے ذریعے آنے والے لوگوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ "بہاؤ" میں مستنصر حسین تارڑ نے بھی اس واقعہ کو اپنے ناول میں کسی فلم کی طرح فلمایا ہے۔ جیسے برتنوں پر اس وقت کا فن کار (پکلی) پھول اور بیل بوٹے بناتا ہے تو اس کا مقصد اپنے فن اور تہذیب کو آنے والے لوگوں کے لیے محفوظ کرنا ہوتا ہے۔ پھر آنے والی نسل (صدیوں بعد) اُن کو اپنے آباء کی یادگار سمجھ کر میوزیم میں سجا دیتی ہیں۔

تنقیدی آراء [ترمیم]

محمد ساجد بہاؤ کے بارے میں کہتے ہیں:

"'بہاؤ' انسانی زندگی کا ترجمان ناول ہے جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا[2]۔"

Scanned with CamScanner